⊙ ڈاکٹر سجاد نعیم
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، دی اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور
⊙⊙ محمد اویس
ایم فل اسکالر، شعبہ اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

چھا نگیا رُکھ: دلت سماج کی سوانحی دلیل

Abstract:

In sub-continent the concept of classes is part of its social life from pre-historic times. When we search its basis we cannot ignore the Hindu religion, which is main cause to increase it. In Hinduism the concept of sect and cast is under cover of religion. Hinduism divided it's followers under four divisions as Barhamin, Vaish, Kashtri and Achoot. The lowest cast in Hinduism is also called Harajin, Dalit, untouchable cast. Achoots are considered as un-human, uncivilized and dirty people. They have no respect in society. Now the modern times people are rising their voices against this act. This protest is in many forms like drama, film and other forms of literature and education with the impact of literature an awareness is rising among the people. Because of this awareness and protest Dalit people are facing many hurdles in society. But awareness is provoking in Indian society. This rticle is the auto-biography "Changya Rukh" by Balbir Madhoupori. It discussed many aspects like un-human customs against Dalit people. Their role in society, limited sources of education and jobs "Changya Rukh" is well read auto-biography which is translated in many languages as well.

Keywords:

Fiction, Novel, Translation, Hindusim, Dalit, Balbir Madhoupori

ہزاروں سال پہلے جب سماج میں زرعی انقلاب نے اپنے قدم جمانا شروع کیے تو فرد کے اندر ذاتی ملکیت کا تصور قائم ہوا۔ معاشرے میں طبقات بننا شروع ہو گئے۔ جب آریاؤں نے (۱۴۰۰ ق ۔م) دراوڑوں پر حملہ کیا تو ان کے ذہن میں بھی زمینوں کو فتح کرنے اور لوگوں کو اپنا غلام بنانے کے منصوبے موجود تھے۔ بیشتر مؤرخین کا خیال ہے کہ ہندوستان میں ذات پات کا نظام آریاؤں کی آمد سے شروع ہوا۔ آریہ حاکم تھے اور انہوں نے مقامی لوگوں کو مغلوب کرنے کیلئے ایسے کئی نظریات پیش کیے جن سے دراوڑ خود کو مفتوح قوم سمجھنے لگے۔ آریاؤں کو ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ کہیں ہمارا ان کے ساتھ انسلاک نہ ہو جائے۔ انہوں نے ذات پات کے ایسے کئی مفروضے قائم کر دیئے جن سے اختلاط کی امید قریباً ختم ہو گئی۔ عماد الحسن آزاد فاروقی کا خیال ہے کہ ''اس نظام کا یہ بھی خاصہ تھا کہ اس میں ہندوستان کے غیر آریہ قدیمی باشندوں کو شودر کی حیثیت سے سماج میں سب سے پست مرتبہ دیا گیا اور ان کا دھرم صرف آریہ نسل کی تین اعلیٰ ذاتوں کی خدمت قرار دیا گیا۔''(۱) آریہ تعداد میں چونکہ کم تھے اس لیے انہوں نے اپنی شناخت کے کھو جانے کے خوف سے مفتوح سماج کو طبقات میں بانٹنا شروع کر دیا۔ اس طرح ہر طبقہ اپنے مخصوص پیشے سے پہچانا جانے لگا۔ یہ تمام معاملات نہ صرف ان کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ بن گئے بلکہ یہ تصور مذہب کے ساتھ بھی جوڑ دیا گیا۔

دراوڑوں نے اپنا گزر بسر کرنے کیلئے ان پیشوں کو اپنایا جنہیں سماج میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ لوگ خاکروب، موچی، بھنگی، کمہار وغیرہ جیسے پیشوں سے جڑ گئے اور یہیں سے ان کی ''ذات'' کا فیصلہ بھی ہو گیا۔ یہ سلسلہ نسل در نسل منتقل ہونے لگا اور ہر شخص اپنے پیشے کی وجہ سے معتبر یا کمتر سمجھا جانے لگا۔ ڈینیل رائیس کے مطابق: ''پابندیوں اور امتیازات، رسوماتی فرائض، مصنوعی پاکی اور ناپاکی والا ذات کا جال پھیلا، جس نے ہندو معاشرے میں نسل سے پیشے کی علیحدگی کے عمل کو بہت آہستگی کے ساتھ جاری رکھا اور اس کے نتیجے میں اس شے نے جنم لیا جس کو ہم 'ذات' کہتے ہیں۔''(۲) سرمایہ دار طبقے نے اپنی قوت اور طاقت کو قائم کرنے کیلئے ایسے کئی مفروضے گھڑ لیے جن سے نچلے لوگ احساس کمتری کا شکار ہو گئے اور وہ آج بھی حاشیے پر زندگی گزار رہے ہیں۔

برہمنوں نے اپنا سماجی مرتبہ بڑھانے کیلئے مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ انہوں نے ہندوستانی سماج میں یہ بات واضح کر دی کہ ذات پات کے نظام کو دیوتاؤں نے ترتیب دیا ہے اور یہی آفاقی سچائی ہے جو ہندوستانی "Cast difference" پر یقین رکھتے ہیں ان کا ماننا تھا کہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی صورت جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایک معروف ہندو تخلیقی داستان کے مطابق ''خداؤں نے دو جہاں کو ایک ابتدائی آدم پروسا سے بنایا تھا۔ سورج کی وسا کی آنکھ سے ماہتاب اس کے ذہن سے برہمن (مذہبی پیشوا) اس کے ذہن سے کشتوریا (فوجی) اس کے بازوؤں سے، ویشیا (کسان اور تاجر) اس کی رات سے اور شودر (نوکر) اس کے پیروں سے''۔(۳) اچھوتوں کے پاس اس مہابیانیے کو تسلیم کرنے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔

ہندوستان میں ذات پات کو سُرعت رفتاری کے ساتھ قبول کیا جانے لگا۔ اس نظام کی جڑیں ہندو سماج میں اس قدر اپنے آپ کو مضبوط کر چکی تھیں کہ یہاں جو بھی حکمران آئے انہیں اچھوتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ جب مسلمانوں نے ہندوستان کو فتح کیا تو جنگوں کے اثرات ہریجنوں پر نہیں پڑے کیونکہ وہ سماج کو بدلنے کیلئے اپنا کوئی حصہ نہیں ڈال سکتے

تھے۔اس لیے مغلوں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔لیکن ایک بات اہم ہے کہ مسلمانوں نے اچھوتوں کو سماجی برابری دینے کیلئے انہیں مسلمان ضرور کیا۔ مذہب کی تبدیلی کے بعد بھی یہ لوگ نچلی ذاتوں میں تقسیم رہے اور انہیں اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ پرکاش ٹنڈن نے مغربی پنجاب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں ذات پات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جو مسلمان جھاڑو یا چمڑے وغیرہ کا کاروبار کرتے تھے وہ اچھوت ہندو ہی تھے جو اپنی قسمت بدلنے کیلئے مسلمان ہو گئے۔ ''لیکن مسلمان ہو جانے کے بعد بھی انہیں ان کاموں سے چھٹکارا نہ ملا گو انہیں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک نظریاتی قسم کی برابری ضرور مل گئی۔''(۴) مگر جب انگریزوں کی حکومت آئی اور ہندوستان میں صنعتی دور کا آغاز ہوا تو وہاں کئی فیکٹریاں قائم ہوئیں۔انگریزوں نے بھی عیسائیت کا پرچار کیا اور کئی اچھوتوں نے اپنا مذہب تبدیل کر کے فیکٹریوں میں ملازمت شروع کر دی۔اچھوتوں کے اندر شعور بیدار ہو چکا تھا اور انہوں نے تعلیم کے حصول کیلئے احتجاج کیا جس کے بعد انگریزوں نے ان کے لیے کئی سکول قائم کیے۔

اچھوتوں کیلئے مختلف نام استعمال ہوتے رہے ہیں۔گاندھی جی نے سب سے پہلے ان کے لیے ''ہریجن'' کا لفظ استعمال کیا۔ یہ لفظ ۱۹۷۰ء کی دہائی تک مستعمل رہا۔ڈاکٹر امبیڈکر نے ۱۹۲۵ء میں دلت کی اصطلاح وضع کی۔ یہ مراٹھی لفظ ہے جس کے معنی ہیں دبایا ہوا یا جسے توڑ پھوڑ دیا گیا ہو۔اس کے بعد ہندوستانی آئین کے مطابق ان کو شیڈولڈ کاسٹ کہا جانے لگا۔ڈاکٹر امبیڈکر نے جو اصطلاح استعمال کی وہ وسیع تناظر رکھتی ہے اور انہیں "Depressed Classes" یا "Untouchable" بھی کہا جا سکتا ہے۔مگر اب انہیں ہندوستان میں ''دلت'' یا ''شیڈولڈ کاسٹ'' کہا جاتا ہے۔دلتوں میں ایسی کئی "Sub Classes" ہیں جنہیں شودروں سے بھی کم تر سمجھا جاتا ہے۔ان میں مہار، مانگ، مڑیگا اور والمیکی وغیرہ شامل ہیں۔

دلت ادب ایسے کئی دلت ادیب ہیں جنہوں نے اپنے مسائل، الجھنوں اور محرومیوں کو ناول، شاعری، آپ بیتی اور گیتوں کی شکل میں بیان کیا ہے۔دلت لکھاریوں کا ماننا ہے کہ سماج میں جو کچھ ہم برداشت کرتے ہیں۔اسے اونچی ذات کا کوئی ادیب بیان نہیں کر سکتا۔اس لیے وہ ''اونچی ذات کے اس ادب سے بھی انکار کرتے ہیں جو ان کے حق میں لکھا گیا ہے چاہے اس نے ترقی پسند سوچ میں اضافہ ہی کیوں نہ کیا ہو۔''(۵) گرچرن سنگھ، گوردیال سنگھ، اوم پرکاش والمیکی، ارجن ڈانگلے، دامان تمبالکر اور جے وی پوار وہ نام ہیں جن کی لکھتوں میں دلت سماج کی نمائندگی نظر آتی ہے۔

جو آپ بیتی مذکورہ مضمون کا موضوع ہے وہ بلبیر مادھو پوری کی ''چھانگیا رُکھ'' ہے۔اس کا پنجابی سے اردو ترجمہ اجمل کمال(۶) نے کیا ہے۔پہلی بار یہ ۲۰۰۴ء میں گرمکھی میں شائع ہوئی۔ ہندوستان کی مقامی زبانوں کے علاوہ اس کا ۲۰۱۰ء میں انگریزی ترجمہ ہوا جو آکسفورڈ پریس سے چھپا۔ یہ دلت ادب کی پہلی آپ بیتی ہے جس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا۔آج کل اس کا روسی اور پولش زبان میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے۔

بلبیر مادھو پوری(۷) ۱۹۵۵ء میں ضلع جالندھر کے ایک چھوٹے گاؤں مادھو پور میں پیدا ہوئے۔ان کی پرورش دیہات میں پائے جانے والے ذات پات کے روایتی ماحول میں ہوئی۔وہ بنیادی طور پر شاعر، ناول نگار، مترجم اور مدیر ہیں۔ان کی اب تک چالیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو ان کی تخلیقات اور تراجم پر مشتمل ہیں۔

اگر آپ بیتی کے نام پر غور کیا جائے تو اس میں ایسی علامت نظر آتی ہے جو نچلی ذات کے لوگوں کا بیانیہ بھی ہے۔ ''چھانگیا رُکھ'' بنیادی طور پر پنجابی کے الفاظ ہیں۔ چھانگیا کے معنی ہیں ''کاٹ دینا'' اور رُکھ ''پیڑ'' کو کہتے ہیں۔ یعنی ایسا درخت یا پیڑ جس کا اوپر والا گھنا اور پھیلا ہوا حصہ کاٹ دیا گیا ہو۔ درختوں کو اکثر ایک خاص وقت میں چھانگ دیا جاتا ہے اور اس طرح وہ پیڑ کم مایہ اور اجنبی دکھائی دیتا ہے۔ کچھ عرصے کیلئے وہ اپنی اصل شکل کھو دیتا ہے لیکن پھر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جب اس پر شگفتہ کونپلیں نمودار ہوتی ہیں۔ دراصل یہ ننھی منی کونپلیں درخت کاٹنے والے کے خلاف خاموش احتجاج ہوتی ہیں۔ اس نام کے ذریعے بلبیر مادھو پوری نے ایسے درخت کو دلت لوگوں کیلئے ایک روشن استعارہ بنا دیا ہے جنہیں سماج میں پھلنے پھولنے سے زبردستی روک دیا جاتا ہے مگر وہ زندگی بھر جدوجہد جاری رکھتے ہیں اور سماجی رویوں کو قبول کرنے کی بجائے مزاحمت پر یقین رکھتے ہیں۔

دلتوں کا تاریخ سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا ماضی ناکامیوں، ذلتوں اور ناانصافیوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کو زندگی کے معیاری اصولوں کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ انہیں ذاتی زمین خریدنے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ کہیں یہ لوگ برہمنوں کی برابری نہ کرنے لگیں۔ اس لیے یہ لوگ ادھوری زندگی گزارتے ہیں اور سماجی تاریخ کی تشکیل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ بلبیر مادھو پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ ہمارے لیے ایک ایکٹ بنایا گیا ہے جس کے تحت ہم برادری کے لوگ مل کر بھی زمین کا کوئی قطعہ نہیں خرید سکتے تھے۔ گاؤں کی طرف اچھوتوں کو رہنے کیلئے جو زمین دی گئی وہ کبھی بھی ہماری ذاتی ملکیت نہ بن سکی۔ ''اچھوت جاگیرداروں اور بھوئیں کے مالکوں کے رحم و کرم پر ڈر ڈر کے وقت کٹی کرتے۔ زمین مالک اسی آدھار پر ان کے ساتھ دھکے شاہی کرتے۔ زبردستی بیگار کراتے۔ ناں لکڑ کرنے پر لاہ پاہ (ذلت، بے عزتی) اور مار کُٹ سرعام کرتے۔''(۸)

اچھوتوں کو برہمن اپنے قریب نہیں آنے دیتے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ان لوگوں کا سایہ بھی ہم پر پڑ جائے گا تو ہم ناپاک ہو سکتے ہیں۔ نچلی جاتی کے لوگ صرف ان کا فضلہ اور مردار جانور اٹھانے کے کام آتے ہیں۔ زیادہ تر اچھوت گاؤں اور شہروں سے دور جھونپڑیوں، خیموں اور درختوں کے نیچے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ برہمنوں نے شناخت سے محروم ان لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ اگر وہ ان کی دل و جان سے خدمت کریں گے تو انہیں زندگی کے مصائب و آلام سے نجات مل سکتی ہے۔ لیکن اگر اچھوت جس عضو سے برہمن کی بے عزتی کرے گا تو اس کا وہ حصہ کاٹ دیا جائے گا۔ اگر وہ اونچی ذات والے کے ساتھ بیٹھ جائے تو اس کی کمر پر داغ لگا کر اسے ملک بدر کیا جا سکتا ہے۔ ''وید سننے پر اس کے کانوں میں سیسہ ڈال دو، پڑھنے پر زبان کاٹ دو، یاد کرنے پر دل چیر دو، شودر کو نیک صلاح کبھی نہ دو۔''(۹)

ہندو سماج میں دلت لوگوں کو ہر جگہ دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دیہاتوں میں رہائش کیلئے ان کو زمین کا جو ٹکڑا ملتا ہے۔ وہ پچھّم (مغرب) کی طرف ہوتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ برہمنوں سے دور رہتے ہیں اور ان کا سایہ بھی نہیں پڑتا۔ یہ رویہ اس لیے بھی اپنایا جاتا ہے تاکہ شیڈولڈ کاسٹ مرکز سے دور رہیں اور حاشیے پر اپنی زندگی گزاریں۔ بلبیر مادھو پوری نے اس رویے کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ''دوسری یہ سوچ تھی کہ پنڈ کا گندا پانی ہمیشہ نشیب یعنی پچھّم کو بہتا ہے۔ اس لیے ان جیسے لوگوں کا رہنا بسنا گند مند میں ہی مناسب ہے۔ ایسے گھٹیا اور گھناؤنے نظام کا کھلا نمونہ آج بھی سارے دیہات میں

دیکھا جا سکتا ہے۔''(۱۰)

دنیا میں موجود ہر مذہب کا بنیادی نظریہ امن، محبت اور برابری ہے مگر ذات پات کا تصور ہندو مذہب کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ہم اس تصور کو مذہب سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ اس کی بنیادی وجہ برہمنوں کی وہ من گھڑت کہانیاں ہیں جو انہوں نے دیوتاؤں سے منسوب کر رکھی ہیں۔ اچھوت لوگوں کے ساتھ جو سلوک اپنایا جاتا ہے اس میں مذہب ہتھیار ضرور بنتا ہے مگر اس مسئلے کی اصل وجہ نسلی تفاوت ہے۔ برہمن سماج میں اپنی بڑائی حاکمیت اور انفرادیت کو قائم رکھنے کیلئے مذہب کی توجیہات اپنے اپنے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے مذہبی افعال میں بھی شیڈولڈ کاسٹ کیلئے نفرت اور بغض و کینہ نظر آتا ہے۔ جب پرشاد بانٹا جاتا ہے تو اس میں بھی برہمن یہ خیال رکھتا ہے کہ پرشاد دیتے وقت اس کا ہاتھ کسی دلت کو نہ چھو جائے۔ بلبیر مادھو پوری اپنے ایک تجربے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب ہماری پرشاد لینے کی باری آتی تو بانٹنے والا غصے سے کہتا کہ کم ذات کے لوگ آرام سے بیٹھ جاؤ تمہاری باری بھی آئے گی۔ لیکن ہم کھڑے کھڑے اپنے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے آگے بڑھانے کی کوشش کرتے۔ ایسے میں پرشاد کبھی ہماری بُک (ہتھیلی) میں آتا اور کبھی نیچے گر جاتا۔ جب زمین سے اٹھانے لگتے تو اتنی دیر میں کوئی کتا پرشاد چاٹ چکا ہوتا۔ ''ایسے ہی ایک بار میری کولی (تانبے کی کٹوری) اس وقت ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی جب 'بھائی' جلدی جلدی زور زور سے آچھڑ واں جیسا (ذرا سا) پرشاد اوپر ہی سے ڈال رہا تھا کہ کہیں اس کا ہاتھ کولی یا ہاتھ کو نہ چھو جائے۔''(۱۱)

شیڈولڈ کاسٹ ناانصافیوں کو برداشت کرنے کے بعد اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ ہم واقعی اس جنم میں برہمنوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ ان کی نفسیات بھی تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر یہ لوگ اپنے افعال میں جاتی کا موازنہ برہمنوں سے کرنے لگتے ہیں۔ اچھوت لوگوں کو یہ رویہ وراثت میں ملتا ہے۔ گھروں میں اپنے بچوں کو بار بار یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ کم تر اور پسے ہوئے لوگ ہیں اس لیے وہ کسی صورت بھی برہمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا منفی پہلو یہ سامنے آتا ہے کہ اگر ان کے کسی بچے میں پھلنے پھولنے اور زندگی میں کامیاب ہونے کے امکانات موجود ہوتے ہیں تو وہ بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں ایسی کئی جمالیاتی خوشیاں ہوتی ہیں جو اچھوتوں کے بچے حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر کسی سماجی رویے سے پہلے ان کا گھریلو اور روایتی نظام ہی ان کو خواہشات کا گلہ گھونٹ دیتا ہے۔ بلبیر مادھو پوری ایسے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک دن میرے دل میں یونہی خواہش بیدار ہوئی کہ گھر کے آنگن میں کوئی پیڑ لگایا جائے۔ میں کُھرپے کے ساتھ مٹی اکھاڑ رہا تھا کہ بھائیا (باپ) میرے پاس آیا اور کُھرپی ہاتھ سے چھین کر گرج پڑا کہ میرے اندر جٹوں کی برابری کرنے کا خیال کیسے آیا۔ ان کے پاس تو کئی ایکڑ پر مشتمل ذاتی ملکیت ہے لیکن ہماری قسمت میں یہی تھوڑی سی زمین ہے۔ ''آم کے بوٹے کی طرح میرا من بھی مرجھانا شروع ہو گیا۔ کسی طوفانی جھکڑ نے میری ریجھ کے بور کو بے وقتے ہی جھنجھوڑ ڈالا۔ میں تب بھی سوچتا، ہمارے آنگن میں بھی کوئی رُکھ ہووے، چڑیاں گھگھیاں اور طوطے آ بیٹھیں۔''(۱۲)

شیڈولڈ کاسٹ لوگوں پر سالہا سال ایک جیسا موسم رہتا ہے۔ باہر کا جو بھی موسم ہو ان کی خارجی اور داخلی کیفیت دکھوں سے مزین ہوتی ہے۔ انہیں زندگی کی بے رحم حقیقتوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ سردی ہو یا گرمی قدرت نے ان کے لیے

کہیں بھی آسودگی نہیں رکھی۔انہیں ہمیشہ یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ تم سماج کے مرکزی دھارے سے کٹے ہوئے ہو۔اسی لیے اچھوتوں کے پاس ایک برتن ہوتا ہے جس میں یہ تھوکتے ہیں اور ایک لمبی چھڑی جس سے اپنے قدموں کے نشانات مٹاتے ہیں تا کہ کوئی برہمن ناپاک نہ ہو جائے۔ان کے لیے ایسے اصول وضوابط تشکیل دیئے جاتے ہیں جو انہیں کم مائیگی کا احساس دلاتے ہیں اس طرح یہ لوگ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں۔بلبیر مادھو پوری لکھتے ہیں کہ جب بھی سردیوں کا موسم آتا تھا تو ہمارے گھر کے سامنے آگ جلتی تھی۔ہر کوئی سردی سے بچنے کیلئے آگ تاپنے آتا۔اچھوتوں میں سے اگر کوئی اپنا بالن (ایندھن) نہ لے کر آتا تو اسے آگ تاپنے سے روک دیا جاتا تھا اور بات ہاتھا پائی تک جا پہنچتی تھی۔ہم آگ کی تپش محسوس کرنے کے بعد ٹھنڈے پیروں کے ساتھ سکول کی جانب دوڑ پڑتے۔ہمارے پیروں میں جوتا تک نہیں ہوتا تھا جبکہ جٹوں کے بچوں نے سردی سے بچنے کے لیے خود کو سویٹر میں ملفوف کیا ہوتا تھا۔"میں سوچتا،کوئی جنا ایک سویٹر مجھے بھی دے دیوے۔میں بھی اس کا نِگھ (گرمائش) لے کے دیکھوں۔"(۱۳)

اچھوتوں کو ناپاکی کا پیکر سمجھا جاتا ہے۔ہندو سماج میں کسی بھی انسان کی پیدائش اس کی ذات اور مقام و مرتبے کا تعین کرتی ہے۔جب وہ اس دنیا میں آجاتا ہے تو پھر اس کیلئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی شناخت کو تبدیل کر سکے۔ان کے پاس برہمنوں کی طرف سے گھڑے گئے مذہبی عقائد،آفاقی حقیقتیں اور الوہی نظام کو ٹھکرانے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔اچھوتوں کے لیے لوگوں کے رویے اہم ہوتے ہیں جو ان کی شخصیت کو بگاڑنے یا سنوارنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔بلبیر مادھو پوری لکھتے ہیں کہ میں جب نلکے سے پانی پیتا تو اونچی ذات کا جو بھی لڑکا میرے بعد آتا وہ نلکے کو اچھی طرح دھوتا اور اسے پاک کرتا۔میں سوچتا رہ جاتا کہ میرے ہاتھ اس سے کس طرح مختلف ہیں۔یہ بھی تو جانوروں کی دم پکڑ کا ادھر اُدھر گھماتے ہیں۔جب مردار جانور اچھوتوں نے اٹھا لیا ہوتا تو جٹیاں پورے گھر کو ستنام واہگرو کے ورد کے ساتھ پاک کرتیں۔"میں سوچتا یہ ضرور کوئی جادو منتر ہوگا،لیکن یہ کس کو سنایا ہوگا؟مردار کو؟مردار اٹھانے والوں کو؟یا پھر بولنے والے نے اپنے آپ کو سنایا؟"(۱۴) اچھوت لوگ مردار جانور کا گوشت کھاتے ہیں اور روٹیوں کو نرم کرنے کیلئے جو گھی استعمال ہوتا ہے وہ انہیں مجبوراً مردہ جانوروں کی چربی سے نکالنا پڑتا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اچھوت لوگ کس قدر بے رحم زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

جب بھی ایک حاکم طبقہ کسی دوسرے پر اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرتا ہے تو ایسے کئی مہابیانیے گھڑ لیتا ہے جو اپنے سے کم تر لوگوں کو مغلوب کرنے کے لیے سودمند ثابت ہوتے ہیں۔برہمن اچھوتوں کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ تم خدا کی طرف سے اسی حالت میں بھیجے گئے ہو۔ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں کہ"ہندو مذہب میں اچھوتوں کیلئے مذہبی جواز یہ تھا کہ یہ پچھلے گناہوں کی سزا میں اچھوت پیدا ہوئے ہیں اس لیے منطقی طور پر ان کا وجود ناپاک ہے اور اگر وہ کسی دوسری ذات والے کو چھو لیں تو محض ان کے چھونے سے وہ ناپاک ہو جائے گا۔"(۱۵) اچھوتوں کے ذہنوں میں بھی یہ تصور قائم ہو چکا ہے کہ اگر وہ یونہی دل و جان کے ساتھ برہمنوں کی خدمت کریں گے تو اگلے جنم میں ان کو اس کا صلہ ضرور ملے گا۔لیوس مور نے اچھوتوں کے اس مفروضے کو کچھ یوں بیان کیا ہے کہ شودر فرمانبرداری اور کشادہ دل کے ساتھ خدمت کرتے ہیں اور وہ ہر جنم میں ذات کی تبدیلی پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ برہمن کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو جاتے ہیں۔

''اس ابتدائی مرحلے میں بھی ہندوستانی معاشرہ متعین ذاتوں پر مطمئن تھا اور ان طبقات میں اوپر کی طرف جانے کا واحد ذریعہ دوبارہ جنم تھا۔''(۱٦)

بلبیر مادھو پوری نے آپ بیتی میں اس پہلو کو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لوگ اس سماجی رویے سے اُکتا چکے ہیں اور کفِ افسوس مل رہے ہیں کہ وہ اس دنیا میں کیوں آئے۔ اس کے پیچھے ذات پات کے علاوہ معاشی سوال بھی جڑا ہوا ہے۔ جب انسان کو تمام رستے مفقود نظر آئیں تو وہ زندگی کی لا حاصلی اور بیگانگی پر سوال اٹھانے لگتا ہے کہ اگر وہ اس دنیا میں نہ بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ بلبیر مادھو پوری اپنے بھایئے (باپ) کے ذریعے اس کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ ''میں کہاں ڈاکا مارلوں؟ بہتوں سے پوچھ لیا۔ مانگو تو کیا دونی نہیں دیتا، بھایئے نے ماں کی بات بیچ میں کاٹ کر جھئی سی لے کر پڑتے ہوئے کہا، پھر پتا نہیں اس کے جی میں آیا کہ بولنے لگا، 'بھتیر ا بھیڑ بھنا تا ہوں، پھر بھی دتھے کا دتھا، نہیں لگتا۔ ہماری سالی کی قسمت ہی ایسی ہے۔ خبرے کن کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ اس سے تو پیدا ہی نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ کیا جاتا ایسے پیدا نہ ہونے سے۔''(۱۷) جب انسان کو کسی بھی چیز کا احساس ہو جائے تو آگہی کا دکھ اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔ مذکورہ بالا سطروں میں بھایًا (باپ) اپنی قسمت پر جو افسوس کر رہا ہے وہ زندگی کے لامختتم دکھوں کو برداشت کرنے کے بعد پیدا ہوا ہے۔

ہندوستان میں ایسے کئی اچھوت ہیں جنھوں نے سماجی رتبہ حاصل کرنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہب تبدیل کرنے سے ان کا مقدر بھی بدل جائے گا۔ دلت لوگوں نے مذہب تبدیل کر کے شدید احتجاج کیا اور برہمنوں کو بتایا کہ ان کے لیے سماجی برابری کا حصول زیادہ اہم ہے جبکہ مذہب کو وہ کوئی ثانوی چیز سمجھتے ہیں۔ اس کی بڑی مثال ڈاکٹر امبیڈکر کی ہے جنھوں نے اچھوتوں میں سیاسی و سماجی شعور پیدا کرنے کی آخری دم تک کوششیں کیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک ایسا معاشرہ جو ذات پات کے نظام میں مضبوطی سے جکڑا ہوا ہے اس میں آئندہ نسلوں کا مقدر بدلنا ناممکن ہے۔ اسی لیے وہ ۱۹۵٦ء میں اپنے پانچ لاکھ ساتھیوں کے ساتھ بدھ مذہب میں شامل ہو گئے۔

ہندو سماج میں بعض اچھوتوں کو شودروں سے بھی کم تر سمجھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کو شام سے پہلے باہر نہیں نکلنے دیا جاتا کیونکہ اس وقت سائے طویل ہوتے ہیں اور وہ برہمن کو ناپاک کر سکتے ہیں۔ اس رویے کو بلبیر مادھو پوری نے اپنے بھایئے (باپ) کے ذریعے کچھ یوں بیان کیا ہے کہ ہماری بھی کوئی زندگی ہے؟ ہمارا شمار نہ برہمنوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی کھتریوں، ویشنوں یا شودروں میں۔ ہم کس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''نہ ہمارا دھرم نہ ورن! کوئی پوچھنے والا ہووے کہ ہم ہندو کدھر سے ہوئے؟، بھایًا بولتے بولتے جیسے ہانپ گیا تھا اور دم مار کے جیسے پھر بولنے لگا، کئی بار میرا جی کرتا ہے کہ آپاں سکھ بن جائیں۔''(۱۸)

اچھوتوں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ ان کو ایک الگ قوم سمجھا جائے۔ مگر جب وہ پیدا ہوتے ہیں تو ذلت اور رسوائی ان کا مقدر ہوتی ہے۔ انہیں ہر سطح پر تحقیر آمیز رویہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ برہمنوں کی طرف سے یہ حکم بھی صادر کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے نام ان چیزوں پر رکھیں جن سے کراہت کا احساس ہو۔ اس طرح دلت ایسے نام رکھنے پر مجبور ہیں جن سے ذلت، بے عزتی اور رسوائی کی طرف اشارہ ہوتا ہو۔ بلبیر مادھو پوری اپنے بھایئے (باپ) اور ان کے ایک دوست کے

درمیان ہونے والے مکالمے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ادھر تو ہم کو بچوں کے نام بھی دنوں کے ناموں پر رکھنے پڑتے ہیں، وہ بھی وگاڑ کر، جیسے سومو، منگلو، بدھو وغیرہ یا پھر جیو جنتوؤں، پشو، پنچھیوں کے ناموں پر۔ جیسے میرا ہی نام ہے مچھر داس، اس کا پکھی داس، اس کا طوطا رام، اور وہ کھڑا ہے چڑی رام، اور وہ کھڑا ہے ہگی (ٹٹی) رام اور وہ موتر رام؟' بھائیے نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے جیسے بھیوں کی ساجی پریشانی کی تائید کے لیے بات چھیڑی ہو۔'ہمرے سبھی نام ایسے ہی گندمندر پر ہیں۔''(۱۹) بلبیر مادھو پوری کو بھی ہندو سماج میں اس رویے کا سامنا کرنا پڑا اور جب انہوں نے عملی زندگی کی جانب سفر شروع کیا تو اپنا نام تبدیل کر لیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے دلتوں پر تعلیم کے دروازے کھل گئے تھے۔ انگریز ذات پات پر یقین نہیں رکھتے تھے اس لیے انہوں نے ہر طبقے کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے قوانین وضع کیے۔ جب اسکولوں میں شیڈولڈ کاسٹ کے داخلے شروع کیے گئے تو اونچی ذات کے جٹوں کی طرف سے ردعمل آنا شروع ہو گیا اور انہوں نے احتجاجاً کلاسوں کا بائیکاٹ کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن جب انگریزوں نے اپنے فیصلے پر سختی سے عمل کروانا شروع کیا تو بالآخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ برہمن ڈیسکوں اور کرسیوں پر بیٹھیں گے جبکہ دلت ٹاٹ پر۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے جب دلت تحریک کا آغاز کیا تو اس بات پر زور دیا کہ اچھوتوں کو علیحدہ اسکول بنا کر دیے جائیں مگر برہمنوں نے اس مطالبے کی شدید مخالفت کی۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی کوششوں سے ہی اچھوت طلبا کے لیے تعلیمی اداروں میں مخصوص نشستیں مقرر کی گئیں۔ اس جدوجہد کے باوجود بھی اونچی ذات کے بچوں میں اچھوتوں کے لیے غم وغصہ اور نفرت قائم رہی۔ وہ ان کو کلاس رومز میں کم تر ہونے کا طعنہ دیتے۔ بلبیر مادھو پوری اس متعلق لکھتے ہیں کہ میری ماں مجھے گڑ کا میل لانے کے لیے بھیجا کرتی تھی۔ اگر میری جماعت کا کوئی لڑکا مجھے میل سے بھری بالٹی لاتا ہوا دیکھ لیتا تو اگلے دن اسکول میں جٹوں کے بچوں کے ساتھ مل کر میرا مذاق اڑاتا۔ ''میل پی پی کے تم لوگوں کے رنگ بھی میل جیسے ہو گئے ہیں!۔۔۔ میل پینی جات، پھر بھی ہمارے آگے اکڑتی رہتی ہے۔۔۔ ان جاڑوں میں اچھا داؤ لگا ہو گا ماس کھانے کا، بہت کٹے بچھڑے مرتے ہیں، سوکھی ٹھنڈ میں۔''(۲۰) اس سے واضح ہوتا ہے کہ اچھوتوں کے نہ صرف بڑے عمر کے لوگوں بلکہ بچوں کو بھی تحقیر آمیز رویے کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ایسی ناانصافیوں کے ساتھ جیتے ہیں۔

اچھوت لوگوں میں سیاسی شعور اس وقت پیدا ہوا جب دیہاتوں سے بلبیر مادھو پوری جیسے لوگ پڑھنے کے لیے شہروں میں گئے۔ انہیں ملکی حالات کا اندازہ ہوا اور سیاسی جماعتوں سے بھی آشنائی ہوئی۔ شہروں میں ایسی کئی انقلابی جماعتیں بھی سرگرم تھیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مخالف آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ہندو سماج میں ''دلت پینتھر'' کے نام سے ایک انقلابی جماعت نے جنم لیا۔ اس کا مقصد اچھوتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا تھا۔ یہ تحریک عالمی رجحانات سے بھی متاثر تھی۔ ''دلت پینتھر'' کے حامیوں کا خیال تھا کہ جو لوگ ذات پات اور مذہب سے باہر رہ کر سوچتے ہیں وہ اس تحریک کے حامی ہیں۔ اس تحریک نے طبقاتی، سیاسی، سماجی اور معاشی نظام کے متعلق اچھوتوں کو نئے زاویے سے سوچنے کی دعوت دی۔ انہوں نے اچھوتوں کی ذاتی ملکیت، تعلیم، ملازمت وغیرہ کے حصول کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں۔ بلبیر مادھو پوری جب اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر گئے ''تو کمیونسٹ پارٹی انڈیا'' کے رکن بن گئے اور گاؤں آ کر

اپنی ذات کے لوگوں کو نئی امید کے ساتھ بغاوت پر قائل کرنے لگے۔ وہ ''چھانگیا رُکھ'' میں لکھتے ہیں کہ گاؤں میں اس تحریک کی باقاعدہ شاخ ہوتی تھی۔ ہم کسانوں اور مزدوروں کے مسائل پر گفتگو کرتے۔ جب بھی کوئی ذات پات کی بات کرتا تو ہم انہیں سمجھاتے کہ ''بلاوجہ بات نہ بڑھاؤ۔ جات کو گولی مارو، جماعت کی بات کرو اور پھر جب معاشی حالات برابر ہو گئے تو جات پات کو کون پوچھنے والا''(۲۱)

شیڈولڈ کاسٹ کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب یہ لوگ دیہات چھوڑ کر شہروں میں آتے ہیں۔ گاؤں میں تو تمام لوگ ان کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں لیکن شہر کے لوگ اس تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں یہ اپنی شناخت چھپا کر تو یہاں نہیں رہ رہا۔ اگر کسی اچھوت کو کرائے پر مکان لینا ہوتا ہے تو وہ اپنی ذات تبدیل کر لیتا ہے تاکہ مالک مکان اس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہ کرے۔ اس طرح اچھوتوں کے درمیان بھی تعصب کی فضا قائم ہونے لگتی ہے۔ اگر کوئی اچھوت کسی بڑے عہدے پر فائز ہے تو وہ ہرگز نہیں چاہے گا کہ اس کی ذات کا کوئی فرد اس سے جاتی کا پوچھے۔ جب کچھ لوگ ایسے گھناؤنے عمل پر اتر آتے ہیں تو ذات پات کو ختم کرنے کی جدوجہد کمزور پڑنے لگتی ہے۔ بلبیر مادھو پوری جب ملازمت کے سلسلے میں اپنی بیوی کے ساتھ شہر میں گئے تو ان کو بھی ایسے رویے کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے کرائے کا مکان تلاش کرنا شروع کیا تو انہیں اپنی ذات چھپانی پڑی لیکن جب مالک مکان کو ان کے کسی غیر شعوری عمل سے ذات کا علم ہو جاتا تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے مکان کروالیتا۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ ''میں جب دفتر سے آتا تو مکان مالک اپنی بیٹھک کے سامنے حقہ پیتے ہوئے اکثر پوچھتا، 'بھائی، ناراض مت ہونا، آپ کس جاتی کے ہو؟' 'ہم سکھ ہیں!' میں نے اپنی پگڑی سنوارتے ہوئے کہا۔''(۲۲) شہروں میں سنیما، ہوٹل، ٹرانسپورٹ اور تفریحی مقامات پر اکثر اچھوتوں سے ذات پوچھی جاتی ہے۔ جب ان لوگوں سے متعصب رویہ اختیار کیا جاتا ہے تو یہ احتجاج کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کئی دنگے فساد ہوتے ہیں جن میں ان کے گھروں، عورتوں اور بچوں کو زندہ جلا دیا جاتا ہے اور ان پر انصاف کے دروازے بھی بند ہوتے ہیں۔

بلبیر مادھو پوری نے مذکورہ آپ بیتی میں اپنی شخصیت کا تجزیہ ذات پات کے نظام میں رکھ کر کیا ہے۔ وہ اس پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرتے بلکہ فخر کے ساتھ اپنی جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے ان رکاوٹوں، ناانصافیوں اور محرومیوں کا بیان بڑی تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو سماج میں ان کے لیے پیدا کی گئی تھیں۔ ایک دلت جواب زندگی میں کامیابیوں کا طویل سفر کر چکا ہے اس کے لیے اپنے ماضی کو کھوجنا یقیناً ایک مشکل عمل ہوگا۔ مگر انہوں نے کہیں بھی جذباتی انداز نہیں اپنایا بلکہ حقیقت کو سہل انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آپ بیتی صرف ایک گاؤں کی کہانی نہیں بلکہ ان اچھوتوں کا بیانیہ ہے جو ذات پات کے مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ اس میں تمام مفروضوں اور مہابیانیوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان میں دلتوں کے ساتھ ہر جگہ مختلف رویہ اپنایا جاتا ہے۔ مذکورہ آپ بیتی میں اچھوتوں کا جو بیانیہ ملتا ہے اس کو سمجھنے کے لیے پنجاب کی سیاسی، سماجی اور عصری حالات کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ بلبیر مادھو پوری نے سماج میں پیدا ہونے والی ان معروضی تبدیلیوں کو بھی دکھایا ہے جو دلت لوگوں کی محنت اور جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ اس طرح یہ آپ بیتی ایک جامد سماج کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ تمام واقعات زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ 'چھانگیا رُکھ' میں بلبیر پرامید

نظر آتے ہیں کہ ایک دن ہندوستان سے ذات پات کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو ایسے کئی اشارے ملتے ہیں کہ جس کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ لوگوں کے ذہنوں سے کبھی بھی چھوا چھوت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سماجی انقلاب نہایت ضروری ہے کیونکہ ہندو دھرم کے پیروکاروں نے اس مسئلے کو ختم کرنے کی بجائے ہوا دی ہے۔اس نظام سے چھٹکارا اس وقت ممکن ہے جب سماج معاشی طور پر آسودہ ہو جائے گا۔

اگر جدید ہندوستان کے سماجی حالات کو دیکھا جائے تو ذات پات کے نظام میں کافی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ زیادہ تر لوگ اپنے روایتی پیشے ترک کر چکے ہیں۔شیڈولڈ کاسٹ کے لیے قوانین ترتیب دیے گئے ہیں جن میں ان کو حکومت کی طرف سے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔آئین کے مطابق ہندوستان میں چھوا چھوت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لیے سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔''دستور کی دفعات ۱۵،۲۵(۲)،۲۹،۳۸،۴۶ چھوت چھات کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے متعلق ہیں یعنی افراد کے کسی گروہ کے خلاف ہر قسم کے امتیازات کی روک تھام کر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ چھوت چھات کے خاتمے کے لیے مثبت اقدام کیے گئے ہیں۔عوام کے پس ماندہ طبقوں اور خاص طور سے ہریجنوں اور آدی باسیوں کی تعلیمی اور اقتصادی بہتری کے مواقع پیدا کیے گئے ہیں۔''(۲۳) مغربی اصولوں اور طرزِ زندگی کو اپنانے سے شیڈولڈ کاسٹ کی زندگیوں میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ان کی ظاہری حالت بدل چکی ہے اور وہ جدید تقاضوں کے مطابق اپنی شخصیت ترتیب دے رہے ہیں۔

تعلیم عام ہونے کی وجہ سے دلت لوگ سول سروسز میں بھی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔اب نوجوان آپس میں دوستی کرتے وقت ذات پات کا نہیں پوچھتے۔جبکہ شادی کے موقعوں پر ابھی تک روایتی تصورات کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ جب تک اس رشتے کے ذریعے ان کا انسلاک نہیں ہوتا، Cast System کا مکمل خاتمہ ناممکن ہے۔ پہلے اچھوتوں کو گردوارے میں داخل نہیں ہونے دیا جاتا تھا لیکن اب ایسی کوئی پابندی نہیں۔بعض گردواروں میں ابھی تک Anti Dalit آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔اس کے علاوہ اچھوتوں کی شمشان گھاٹوں تک رسائی نہیں۔جب ان کے ہاں کوئی مر جاتا ہے تو انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن اس صورت حال کے باوجود بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلتوں کے مسائل میں کمی واقع ہوئی ہے۔بلبیر مادھو پوری نے اپنی اس آپ بیتی میں ذات پات کے خاتمے کا جو خواب دیکھا ہے اس کی عملی صورت اسی وقت ممکن ہے جب برہمن مذہبی بیانیے کو تبدیل کریں گے اور ہندو دھرم اچھوتوں کو قبول کرے گا۔ ورنہ یہ لوگ لکھتوں کے ذریعے اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھاتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ عمادالحسن آزادفاروقی، دنیا کے بڑے مذاہب ،(لاہور:ادارہ تاریخ وثقافت اسلامیہ،۲۰۱۸ء)،ص۶۱

۲۔ ڈینزل اِبٹسن، پنجاب کی ذاتیں،(لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۵ء)،مترجم:یاسر جواد،ص۲۱

۳۔ یووال نوح ہراری،بندہ بشر،(کراچی:سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۹ء)،مترجم:سعیدنقوی،ص۱۱۱

۴۔ پرکاش ٹنڈن،پنجاب کے سو سال،(لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۸ء)،مترجم:رشیدملک،ص۸۴

۵۔ مبارک علی،رضی عابدی،اچھوت لوگوں کا ادب،(لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۰۴ء)،ص۴۹

۶۔ اجمل کمال طویل عرصے سے 'آج' رسالہ نکال رہے ہیں اورانہوں نے بے شمار تراجم کیے ہیں۔اگر'چھانگیا رُکھ' کے ترجمے کی بات کی جائے تو یہ ایک کمزور ترجمہ ہے۔کئی پنجابی لفظوں کا ترجمہ کرنے کی بجائے انہوں نے ان کو اصل حالت میں ہی رہنے دیا ہے جس سے ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ایک اردو قاری کے لیے اس ترجمے کو پڑھنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔مترجم کو چاہیے تھا کہ وہ تمام پنجابی لفظوں کو اردو ادب میں ڈھالتے تا کہ اس میں روانی آسکتی۔

۷۔ بلبیر مادھو پوری کے سوانحی حالات اور شخصیت کو تفصیل سے جاننے کے لیے یہ ویب سائٹ ملاحظہ کریں:
www.balbirmadhopuri.com

۸۔ بلبیر مادھو پوری، چھانگیارُکھ،،(کراچی: آج کی کتابیں،۲۰۲۰ء)،مترجم:اجمل کمال،ص۱۵

۹۔ محمد اکرم رانا،بین الاقوامی مذاہب،(اسلام آباد:پورب اکادمی،۲۰۰۹ء)،ص۴۰

۱۰۔ چھانگیارُکھ،ص۱۷

۱۱۔ ایضاً،ص۱۹

۱۲۔ ایضاً،ص۲۱

۱۳۔ ایضاً،ص۳۳

۱۴۔ ایضاً،ص۳۵

۱۵۔ اچھوت لوگوں کا ادب،ص۱۷

۱۶۔ لیوس مور،مذاھب عالم کا انسائیکلو پیڈیا،(لاہور:نگارشات پبلشرز،۲۰۰۶ء)،مترجم:یاسر جواد، سعدیہ جواد،ص۱۷۴

۱۷۔ چھانگیارُکھ،ص۴۶

۱۸۔ ایضاً،ص۷۴۔۷۵

۱۹۔ ایضاً،ص۹۵

۲۰۔ ایضاً،ص۱۱۷۔۱۱۸

۲۱۔ ایضاً،ص۱۹۰۔۱۹۱

۲۲۔ ایضاً،ص۲۲۲

۲۳۔ ایم۔این سری نواس، جدید ہندوستان میں ذات پات اور دوسرے مضامین ،(نئی دہلی:قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،۲۰۰۱ء)،مترجم:شہباز حسین،ص۶۰